Dr. Shyama Prasad Mukharjee University ,Ranchi

B.A sem-06

Sub-Urdu,paper-14

(۱) میر کی خودنوشت کا نام کیا ہے؟

(الف) ذکر میر (ب) فیض میر (ج) نکات الشعراء

(۲) میر کس نواب کی دعوت پر لکھنؤ گئے؟

(الف) نواب واجد علی (ب) آصف الدولہ (ج) شجاع الدولہ

(۳) تضحیک روزگار کس قسم کا قصیدہ ہے؟

(الف) ہجویہ (ب) بیانیہ (ج) مدحیہ

(۴) درد کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) لکھنؤ (ب) بنارس (ج) دہلی

(۵) خدائے سخن کسے کہا گیا ہے؟

(الف) سودا (ب) ذوق (ج) میر

(٦) میر تقی میر کے اردو میں کل کتنے دیوان ہیں؟

(الف) چھ (ب) سات (ج) پانچ

(۷) یہ شعر کس کا ہے؟

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

(الف)غالب (ب)ذوق (ج)درد

(۸)''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے'' کس کا مصرعہ ہے؟

(الف)ولی (ب)میر (ج)درد

(۹) اردو غزل کے سب سے بڑے صوفی شاعر کا نام کیا ہے؟

(الف)درد (ب)مومن (ج)غالب

(۱۰) عہد زریں میں میر اور درد کے علاوہ تیسرے اہم شاعر کون ہیں؟

(الف)سودا (ب)ذوق (ج)غالب

Subjective

(۱۱) میر کی شاعرانہ خصوصیات بیان کریں؟

(۱۲) میر کے معاصرین میں کسی ایک شاعر کا تعارف پیش کریں۔

(۱۳) درد کی صوفیانہ شاعری پر روشنی ڈالیں۔

(۱۴) سودا کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کریں۔

(۱۵) میر کی حالات زندگی بیان کریں۔

(۱۶) صنف غزل پر روشنی ڈالیں۔

(۱۷) ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے'' رشید احمد کے اس قول کی وضاحت کریں۔

(۱۸) درجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

(الف)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں ،کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیمار دل نے، آخر کام تمام کیا

(ب)

عہد جوانی رو رو کاٹا ، پیری میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

(ج)

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا ،سو مرنے کا پیغام کیا

(د)

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کا
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

(ہ)

سارے رندا وباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے،سب کا تجھ کو امام کیا

میرؔ کی غزل (پانچ اشعار)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے، آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا، سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کا
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے، سب کا تجھ کو امام کیا

☆☆☆

(تشریح)

پہلا شعر: دنیا کے اس کارخانے میں انسان کامیابی حاصل کرنے کی ہر ممکن جتن کرتا ہے لیکن ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔ اور وہ ساری تدبیریں جو وہ سوچتا اور کرتا ہے الٹی پڑ جاتی ہے اور آدمی ناکام ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو شاعر نے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے کہا نسان سوچتے کرتے آخر کار اس دنیائے فانی سے ہی کوچ کر جاتا ہے اور کام ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ تدبیروں ترکیبوں کو شاعر نے دل کی بیماری سے تعبیر کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

دوسرا شعر: دنیا میں اتنی آرزوئیں ،تمنائیں دل میں پیدا ہوئیں کہ ان کا پورا ہونا محال تھا۔خاص طور سے جوانی جو آرزوؤں اور خوابوں کی عمر ہوتی ہے اس میں میری خواہشیں پوری نہیں ہوئیں ۔اس لئے جوانی روتے روتے گذر گئی اور بڑھاپے میں تو لیٹ جانا تھا کیونکہ اب تو سارے اعضاء بھی جواب دے چکے ہیں اب ہم کسی خواب کو پورا بھی نہیں کر سکتے۔

تیسرا شعر: میرے محبوب نے مجھے معاف کر دیا یعنی جان بخش دی چاہتا تو سزا دلوا سکتا تھا۔لیکن اس نے جان بخشی کر کے جو فیاضی کی ہے اس میں کوئی کلام نہیں ہے،کوئی حرف نہیں حالانکہ جان بخشی سے پہلے جو بات کہلوا بھیجا تھا وہ واقعی میرے لئے موت کا پیغام تھا۔

چوتھا شعر: اب اس شعر میں شاعر اپنے خدا سے شکوہ کر رہا ہے کہ اے خدا،تو نے مجھے جو اس دنیا میں مختار بنایا ہے یعنی عمل کی جو آزادی دی ہے وہ سب مجھے سمجھ میں نہیں آتی ہے یعنی وہ ناحق لگتا ہے کیونکہ آپ کے فرشتے متعین ہیں وہ مسلسل لکھ رہے ہیں اور اسی لکھے پر آپ فیصلہ صادر فرمائیں گے تو پھر بتائیے کہ ہم مختار کیسے ہوئے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں بھی خدا سے شکوہ ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اے خدا تو انسانوں کے سجدوں کو ہی صرف شرف قبولیت بخشتا ہے۔تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ کون میری بندگی میں سجدوں پہ سجدے کرتا ہے حالانکہ ان سجدہ کرنے والوں میں تیرے نافرمان بھی ہیں،ٹیڑھے ترچھے لوگ بھی ہیں ۔ان کا کوئی عمل میزان میں تولنے کے لائق نہیں ہے۔

☆☆☆

Scanned by CamScanner

غزل: اردو شاعری کی آبرو

غزل ایک مقبول ترین صنف سخن ہے، ہر زمانے میں شعراء نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ آج اردو شاعری کا ایک بڑا قیمتی سرمایہ غزل کی شکل میں موجود ہے۔ غزل کے اس بیش قیمت سرمایہ کا جائزہ لینے کے بعد رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا، لیکن غزل کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ غزل کی ہیئت میں لکھی جانے والی ہر منظوم تخلیق کو غزل کہنا مناسب نہیں۔ یوسف حسین خان کے بقول "بلاشبہ غزل صرف اعلیٰ درجہ ہی کی ہونی چاہئے، نظم اوسط درجہ کی گوارا کی جاسکتی ہے لیکن غزل نہیں کی جاسکتی۔ غزل ہمیشہ بلند ہی ہوگی اگر وہ تغزل کے آداب کی حامل ہے"۔ غزل پر کئے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لئے جانے پر پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر اعتراضات صنف غزل پر اسی لئے کئے گئے ہیں کہ غزل گو شعراء غزل کی روایات اور اس کی فنی نزاکتوں کو کامیابی کے ساتھ برتنے میں ناکام رہے ہیں۔ مثال کے طور پر حالی نے محض انحطاطی دور کی غزل نگاری یا روایتی شعراء کی غیر ذی روح قافیہ پیمائی کو اپنی تنقید و تعریض کا نشانہ بنایا ہے اسی حقیقت کے پیش نظر اختر انصاری ایک کامیاب غزل کی بنیادی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سب سے پہلے اس کو سرشت غزل کا پابند اور روایت غزل کے تسلسل کا نمونہ ہونا چاہئے۔ اور اسے اپنی وصف کے بنیادی لوازمات اور فنی اقدار کے احترام کے ساتھ ساتھ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں، انسان کے پاکیزہ ترین خوابوں، مقدس آرزوؤں اور بلند ترین قدروں سے پورے

Scanned by CamScanner

طور پر مربوط ہونا چاہئے۔"

جہاں تک غزل کی مقبولیت کا سوال ہے تو وہ اس کی قوت تسخیر میں پنہاں ہے۔ غزل عام طور سے محبت اور موضوعات محبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ظاہر ہے عشق و محبت کے جذبات آفاقی ہیں۔ شاید ہی کوئی دل ایسا ہو جو اس جذبہ سے خالی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص غزل کے اشعار کو اپنے جذبات و احساسات کا ترجمان و عکاس سمجھتا ہے۔ اور انھیں اپنے دل کی آواز سمجھ کر پسند کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبت زندگی میں بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں ہے زندگی میں محبت کے سوا بھی کچھ اور تقاضے ہیں۔ غزل زندگی کے اس موڑ پر بھی ہمارا پوری طرح ساتھ دیتی ہے۔ اس میں اتنی لچک ہے کہ وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے اور ہر دور کے احساسات و خیالات اور ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے اور ساغر و مینا کے پردے میں زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح غزل محض شاعری نہیں بلکہ ہماری تہذیبی و جذباتی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ ہماری گزشتہ تین چار سو سال کی تہذیبی زندگی کی دستاویز بن گئی ہے۔

غزل میں پائی جانے والی بے ربطی کو غزل کی خامی قرار دیا گیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ غزل کا حسن ہے کہ اس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور کسی مخصوص جذبہ یا خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ کبھی ایک شعر ہی ہماری نگاہوں کے سامنے ہماری تہذیبی زندگی کی پوری تصویر پیش کر دیتا ہے۔ منور لکھنوی کی غزل کا یہ شعر کس طرح ایک پوری تہذیبی زندگی کی شکست و ریخت کی داستان سناتا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اسی طرح میر کی غزلوں میں ہمیں میر کے ٹوٹے ہوئے دل کی طرح تباہ شدہ دہلی کے کھنڈرات کا ہیولیٰ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غالب کی غزلوں کے بہت سے اشعار اس عہد کی تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت کا نوحہ اور سلطنت مغلیہ کی تباہی کا مرثیہ بن گئے ہیں۔ اس سلسلے

Scanned by CamScanner

میں میرؔ اور غالبؔ کے یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
(میرؔ)

دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے
(میرؔ)

کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے
زیر فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میرؔ
(میرؔ)

ایک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آئے
کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
(غالبؔ)

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلا
ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
(غالبؔ)

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
(غالبؔ)

اس مصروف ترین عہد میں غزلیہ اشعار کی یہ ہمہ گیر معنویت اور تہہ داری غزل کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔

انسانی ہمدردی، اخوت و بھائی چارگی اور خلوص کا جذبہ ایک آفاقی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ہر دل کو متاثر کرتا ہے۔ غزل گو شعراء نے اپنی غزلوں میں اس انسانی جذبے کو بڑے اچھے انداز میں سمویا ہے انسانی محبت سے لبریز یہ اشعار بھلا کسے پسند نہیں آئیں گے۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم یہاں

انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم

کسی کا درد ہو چہرے پہ میرے روشن ہے
کسی کا غم ہو دھڑکتا ہے اس پہ دل میرا

زہر کے سوتے پہ میں نے ہونٹ اپنے رکھ دئے
اب کسی کو بھی نہیں پینا پڑے گا زہر غم

کوئی پیاسا نہ رہے میرے خدا میرے بعد
تشنگی جتنی ہو سب میرا مقدر کر دے

Scanned by CamScanner

ایسے ہزاروں اشعار غزلوں میں بکھرے ہوئے ہیں جو ہمدردی و محبت کے آفاقی جذبے کے حامل ہیں۔ ان اشعار کی قوت تسخیر اور دلوں میں جگہ بنا لینے کی بے پناہ صلاحیت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔

آج کے دور کا انسان بے حد پریشان ہے۔ وہ امن و سکون کے چند لمحات کو ترس رہا ہے۔ اسے خدا کی اس وسیع دنیا میں کوئی ایسا نہیں ملتا جو اس کا درد بانٹے اور اس کی چارہ گری کرے۔ ایسی حالت میں غزل کے اشعار اس کی مسیحائی کرتے ہیں اور اس کا درد بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ اشعار زمانے کے بخشے ہوئے غموں کا مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار کی مسیحا صفتی سے بھلا کسے انکار ہوگا۔

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

ہزار چہرے تھے، تم سا نہ تھا کوئی چہرہ
تمہارے ساتھ، تمہاری شباہتیں بھی گئیں

بحال کر گیا سانسیں کسی کا دست شفا
یہ باقی عمر اسی چارہ گر کا حصہ ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اس طرح غزل 'نیم وحشی صنف سخن' بوالہوسی سطحی خیالات کا پلندہ، اور 'بے وقت کی راگنی' کا الزام اپنے سر رکھنے باوجود ہر زمانے میں مقبول رہی، ناسازگار فضاؤں میں بھی پروان چڑھتی رہی اور آج بھی غزل کی کلاسیکی روایات اور اس کے امکانات کو دریافت کیا جا رہا ہے۔ ہماری نئی نسل میر و غالب کے اشعار میں تسکین کا سامان تلاش کر رہی ہے۔ ناصر کاظمی، فراق اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے اشعار اسی وجہ سے پسند کئے جا رہے ہیں کہ ان میں میر کا رنگ غالب ہے۔ رشید احمد صدیقی غزل کی اسی ہمہ گیری، وسیع تر معنویت اور دل میں اتر جانے کی صلاحیت کے پیش نظر اسے 'اردو شاعری کی آبرو' قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم غزل کی انھیں خصوصیات کو غزل کی مقبولیت کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''غزل نے حسن و عشق کے نازک جذبات کی عکاسی کی ہے۔ سیاسی و سماجی حالات کے انتشار کی تصویریں پیش کی ہیں۔ سرمایہ داری اور سامراجیت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ حب الوطنی کے گیت گائے ہیں اور آنے والی صبح کی بشارت دی ہے۔ یہی وسعت اور ہمہ گیریت غزل کی مقبولیت کا راز ہے۔''

Scanned by CamScanner

غزل

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسے بجا طور پر اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اردو میں جب سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اس وقت سے لے کر اب تک غزل طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنتی رہی لیکن اس کی مقبولیت کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتی ہی گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ غزل میں زمانے کے ساتھ بدلنے، ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر طرح کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور اب تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس صنفِ سخن کو کبھی زوال نہ ہوگا۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا۔ اس صنف کو غزل کا نام اسی لیے دیا گیا تھا کہ حسن و عشق ہی اس کا موضوع ہوتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور آج غزل میں ہر طرح کے مضمون کو پیش کرنے کی گنجایش ہے۔ غزل کی ابتدا عربی میں ہوئی۔ وہاں سے یہ ایران پہنچی اور فارسی میں اس نے بہت ترقی کی۔ فارسی ادب کے راستے یہ اردو میں داخل ہوئی اور خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔

غزل کی خصوصیات

غزل کے تمام مصرعے ایک ہی وزن

Scanned by CamScanner

اور ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جسے ہر شعر کے آخر میں دہرایا جائے۔ اس سے پہلے قافیہ ہوتا ہے جس کا آخری حرف یا آخر کے چند حرف یکساں ہوتے ہیں جیسے: دوا، ذرا یا میر، پیر۔ بعض غزلوں میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہوتی ہے۔ بعض میں صرف قافیہ ہوتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ ان کی مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

پہلا شعر مطلع ہے اور تیسرا مقطع۔ "کیا ہے" ردیف ہے جو مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں کے آخر میں دہرائی گئی ہے۔ ہوا، دوا، ماجرا، برا، قوافی ہیں۔

غزل کی دیگر اہم خصوصیات یہ ہیں کہ غزل کا ہر شعر اپنے معنی الگ دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ شعر مل کر معنی دیتے ہیں تو انھیں قطعہ بند کہا جاتا ہے مثلاً میرؔ کے یہ دو شعر ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

عام طور پر غزل کے شاعر کو دو مصرعوں میں مکمل مضمون ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ اختصار اور رمز و کنایے سے کام لینے پر مجبور ہے

Scanned by CamScanner

دوسری خاص بات یہ ہے کہ قصیدے اور مثنوی کی طرح غزل خارجی نہیں بلکہ داخلی صنفِ سخن ہے اور شاعر اس میں وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر گزرتی ہے۔ اس لیے غزل کے خاص موضوعات حسن و عشق ہیں۔

ایک اور بات یہ کہ غزل کا شاعر عام طور پر نرم، سبک اور شیریں الفاظ کا استعمال کرتا ہے حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ شاعر ہر طرح کا لفظ استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے لفظوں کے استعمال کا سلیقہ ہو۔ بہر حال غزل ایک غنائی صنفِ شاعری ہے اور ترنم و موسیقی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ مشاعرے بہت مقبول رہے ہیں اور ان میں غزلوں کی فرمائش کی جاتی رہی ہے۔

Scanned by CamScanner

(۳) میر تقی میرؔ

میرؔ کو اردو شاعری کا خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا اہم وصف قلبی واردات کا اظہار ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف بڑے بڑے شاعروں نے کیا ہے۔ غالبؔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ذوقؔ بھی کمالِ میرؔ کے معترف ہیں۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حالیؔ نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں چاک گریباں کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں سب سے بہترین شعر میرؔ کے اس شعر کو قرار دیا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میرؔ کی شاعری کو المیہ رنگ و آہنگ ان طوفانوں نے بخشا تھا جس سے وہ اپنی ذاتی زندگی میں گزرے تھے۔ مشہور شاعر شیلے کا قول کہ ''ہمارے شیریں ترین نغمے غم انگیز خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔'' صحیح ہے تو میرؔ کی شاعری یقینی طور پر اسی خیال کی عملی تفسیر ہے۔ دہلی کی بربادی کا بھی میرؔ کی شاعری پر گہرا اثر پڑا چنانچہ بقول خواجہ احمد فاروقی ''ان کی شاعری دلی اور دل کا مرثیہ بن گئی۔'' میرؔ خود لکھتے ہیں۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ان کے یہاں عشق ایک ایسی آگ کے مانند ہے جو ان کی ہڈیوں تک کو جلا دیتی

Scanned by CamScanner

ہے۔ زندگی بسر کرنے کا جو حوصلہ اور غموں میں مسکرانے کا جو پُر وقار انداز ہمیں میرؔ کے یہاں ملتا ہے کہیں اور نہیں ملتا۔ ان کے یہاں خودداری اور سنجیدگی کے ساتھ مصیبت سے لڑنے کا حوصلہ موجود ہے ۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ نے اپنی شاعری کی بنیاد حقائق نگاری پر رکھی اور ان تلخ حقیقتوں کو اشعار کا جامہ پہنایا جن سے ہمارے شعرا گھبراتے تھے۔ حقائق نگاری کی بنا پر ان کے اشعار درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میرؔ کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی اپنی شاعری کو درد و غم کا مجموعہ قرار دیا ۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم اتنے کئے جمع کہ دیوان ہوا

جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ مچا ہے میرے دیواں میں

زندگی کے پیچ و تاب سے گزرنے اور طرح طرح کی صعوبتیں اٹھانے کی وجہ سے میرؔ کے کلام میں سماجی شعور جھلکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سب کچھ بننا آسان ہے مگر حقیقی انسان بننا نہایت دشوار۔ وہ دل کے نازک آبگینے کو سنبھال کر رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

میرؔ نے اپنی غزلوں میں وارداتِ عشق کی طرح طرح سے عکاسی کی ہے اور اس کو ہر پہلو سے بیان کیا ہے مگر ان کا معیارِ عشق بہت بلند ہے۔ ان کو کائنات کے ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسی لئے ان کو اس دنیا کا ہر انسان عزیز ہے۔ انھوں نے عشق کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی اہمیت دی ہے۔ میرؔ اپنی نامرادیوں کو تقاضائے عشق قرار دیتے ہیں اور

Scanned by CamScanner

ناسازگار حالات میں بھی اپنے اندر ہمت وحوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں مجازی محبت کے ساتھ ساتھ حقیقی محبت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو کائنات کے ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ میرؔ کے یہاں زندگی بسر کرنے کا جو سلیقہ ہمیں نظر آتا ہے وہ واقعی حیران کن ہے۔ انتہائی غم کے باوجود میرؔ زندگی سے گھبراتے نہیں۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میرؔ کے فن میں غنائیت، موسیقیت اور ترنم ہے اور الفاظ کی تکرار سے اِس میں اور بھی سریلا پن بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں فارسی الفاظ وتراکیب کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ میرؔ الفاظ کے جادوگر ہیں ان کے یہاں سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ دلکش ترکیبیں اور صنائع بھی ہیں۔ خوشنما فارسی تراکیب کا استعمال میرؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میرؔ کو عمر بھر اپنی زبان اور اپنے اطوار پر ناز رہا، لکھنؤ آنے کے بعد بھی انھوں نے سرخم نہ کیا اور اپنی زبان کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا البتہ یہ شکوہ ضرور رہا۔

کس کس ادا سے ریختہ میں نے کہا ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

غرض میرؔ الفاظ ومعنی کا توازن قائم رکھنے، ایجاز و اختصار سے بات کہنے، محاورے اور لفظی رعایتوں کا اہتمام کرنے اور اجزائے کلام کی اصلی ترتیب کو قائم رکھنے میں ماہر ہیں۔ چنانچہ ان کی غزل کیا فکر کیا جذبہ، کیا زبان ہر پہلو سے سربلند ہے اور آج بھی وہ غزل کی دنیا میں سب سے ارفع واعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

(۲) خواجہ میر دردؔ

خواجہ میر دردؔ اپنے زمانے کے ممتاز صوفی بزرگ تھے اور روحانیت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔ ظاہری پرستی کے بجائے وہ حقیقت کی گہرائیوں میں اترنا جانتے ہیں۔ خارجیت پسندی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دہلوی شاعری کی داخلیت پسندی کی روایت کے وہ امام ہیں۔ ان کا محبوب نہایت بلند مقام پر فائز ہے۔ اس کے حسن کے آگے شمع محفل کا حسن ماند ہے ؎

رات محفل میں تیرے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منھ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

وہ حسن و عشق کے مجازی پہلو پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ محض صوفی نہیں ہیں بلکہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی شوخی، چھیڑ چھاڑ اور معاملہ بندی کے مضمون موجود ہیں لیکن شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے ؎

دل دے چکا ہوں اُس بُتِ کافر کے ہاتھ میں
اب میرے حق میں دیکھئے اللہ کیا کرے

دردؔ اپنے صوفیانہ مزاج کے باوجود افسردگی و قنوطیت کے قائل نہیں۔ ان کے مزاج پر رجائیت و نشاط کا غلبہ ہے لیکن اسی شگفتگی و شادابی کے ساتھ ان کے یہاں اداسی و ویرانی کے لمحات بھی آتے ہیں اور وہ پُر درد اشعار کہتے ہیں ؎

وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ان کی غزلوں میں فلسفیانہ مسائل پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ خاص طور سے وہ وحدت الوجود کے مسئلے پر عالمانہ شان سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے ممتاز

Scanned by CamScanner

صوفی اور بزرگ تھے روحانیت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے شاعری کا دامن اظہارِ فن کی خاطر نہیں پکڑا تھا بلکہ اسے جذب و مستی کی اُس وادی کی سیر پر آمادہ کیا جس میں وہ محوِ خرام تھے۔ انھوں نے غزل کو نئی علامتیں، نئے استعارے اور اشارے عطا کیے۔ تشبیہات و استعارات کے آرٹ پر ان کو پوری قدرت ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی مذاق زمانہ کے مطابق شوخی، چھیڑ چھاڑ اور معاملہ بندی کے مضامین موجود ہیں مگر اس میں ان کی سلیقہ شعاری جلوہ گر ہے۔ انھوں نے خلافِ فطرت اور ہیجان انگیز باتیں نہیں کی ہیں اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

ہم نشیں پوچھ نہ اُس شوخ کی خوبی مجھ سے
کیا کہوں تجھ سے غرض جی کو میرے بھایا ہے

شگفتگی و شادابی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں اداسی و ویرانی کے لمحات بھی آتے ہیں اور وہ پر درد اشعار کہتے ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے وہ منہ نہیں موڑتے بلکہ دنیا کے غم و الم کی تاب نہ لا کر خون کے آنسو بھی بہاتے ہیں۔

پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد   غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم   نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

درد نے بھی دیگر ہم عصر شعرا کی طرح حیات و کائنات کے معمے پر غور کیا ہے۔ موت کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس دنیا میں انسان کی مقدرات اور مجبوریوں کا جائزہ لیا ہے۔ بالآخر وہ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرتے ہیں اور اس کے عز و شرف کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ بے ثباتی دنیا پر انھوں نے بڑے موثر اشعار کہے ہیں اور اس عالم بے ثبات کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے۔

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

Scanned by CamScanner

کچھ گل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل
ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے گا شکستہ دل

دلِ صد چاک ہے گلِ خنداں
شادی و غم جہاں میں تو ام ہیں

درد فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں اس مضمون کے اشعار بہت نظر آتے ہیں کہ دنیا میں ہر طرف خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ عشقِ الٰہی کا نام ہی تصوف ہے۔ بندے کو خدا سے عشق ہوتا ہے اور وہ وصل کا طلب گار رہوتا ہے۔

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

غنائیت اور خوش آہنگی میر درد کی غزلوں کا خاصّہ ہے۔ ایمائیت و رمزیت کا حسن پوری طرح جلوہ گر ہے۔ غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں سے وہ بحسن و خوبی کام لیتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کی طرح درد نے بھی اردو غزل کو نئی علامتیں، نئے استعارے اور اشارے عطا کئے۔ تشبیہات و استعارات کے آرٹ پر ان کو پوری قدرت ہے۔ میر کی طرح وہ سلاست و سادگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کے لہجے کا بانکپن ہمیشہ قایم رہتا ہے۔

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
اِدھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

نظر میرے دل کی پڑی درد کسی پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منھ پھیر لے ہے جس کے مجھے روبرو کریں

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے الفاظ میں ''اردو غزل کی روایت میں میر درد ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس میں باعتبار مضامین اور باعتبار فن گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ درجہ کی عشقیہ شاعری کی ہے اور اسی طرح اپنی غزل کو تغزل کی صحیح فضا سے روشناس کیا اور تصوف کے معاملات و مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔''

Scanned by CamScanner

(۱) سودا کی قصیدہ نگاری

مصحفی نے سودا کو قصیدے کا نقاش اول، زبان کا حاکم، قصیدے اور ہجو کا بادشاہ بتایا ہے۔ امداد امام اثر لکھتے ہیں "اگر سودا نہ ہوتے تو اردو قصیدوں کو زیرِ بحث لانا بھی فضول ہوتا۔" سودا واقعی قصیدہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ سودا کو فنِ قصیدہ نگاری سے پوری مناسبت تھی قصیدہ گوئی کے لئے جس بلندی، تخیل، مضمون آفرینی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سودا میں پوری طرح موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۵۳ الا جواب قصائد لکھے جن میں مدحیہ اور ہجو یہ دونوں قسمیں شامل ہیں۔ ان کے ممدوحین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگر چہ انھوں نے بلند مرتبہ لوگوں کا انتخاب مداحی کے لئے کیا۔ سودا نے بہت سے مذہبی قصیدے لکھے اور بعض نقادوں کی رائے ہے کہ ان کی اصل شہرت ان کے مذہبی قصیدوں کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے سرور کائنات اور حضرت علی کی شان میں کئی قصیدے لکھے، محمد شاہ ثانی کی مدح کے ساتھ ساتھ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی بھی تعریف میں قصیدے لکھے، یہ قصیدے انھوں نے قیام دہلی کے دوران لکھے۔ سودا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو قصیدہ کو فارسی کے بالمقابل کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ و تراکیب وغیرہ بھی فارسی کے ٹکر پر استعمال کیں۔ سودا نے قصیدہ کو شہر آشوب سے متعارف کرایا جو کہ ۹۶ اشعار پر مشتمل ہے اور تضحیکِ روزگار نام کا ایک ہجو یہ قصیدہ بھی لکھا۔ ان کے یہاں ایسے قصائد بھی ہیں جن میں سادگی سلاست و روانی ہے مثلاً شہر آشوب۔ تضحیکِ روزگار میں زمانہ کی شکایت ہے اور دوسرے قصائد مضحکہ دہر، صبحِ صادق، باب الجنّت وغیرہ ہیں۔ سودا کے قصیدے میں مطلع تشبیب، مدح وغیرہ سبھی میں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ حضرت علی کی شان میں لکھے گئے قصیدے کا مطلع اس طرح لکھتے ہیں ؎

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغِ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

Scanned by CamScanner

سوداؔ نے اپنے قصیدوں کے ذریعہ ایک بات کو مختلف انداز میں کہنے کا ڈھنگ بتایا۔ انھوں نے ہر ہر قدم ہر تشبیہوں کا سہارا لیا اور سیکڑوں نادر تشبیہیں اردو میں داخل کردیں۔ بقول ڈاکٹر محمود الٰہی ''انھوں نے اُردو شاعری کے لئے تشبیہوں اور استعاروں کا دروازہ کھول دیا۔'' ان کے قصیدوں میں پر وقار اور پُر شکوہ الفاظ کی دھوم دھام ہے۔ وہ بلندی تخیل کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بلندی کے بھی قائل ہیں۔ معمولی اور روزمرہ کے الفاظ و تراکیب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ صنائع بدائع کے استعمال کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں انھوں نے قصیدے لکھے ہیں لیکن مشکل ردیف والے قصیدے میں جوش اور اثر کی کمی پائی جاتی ہے اور شعریت بھی مفقود ہے۔ سوداؔ نے بعض قصیدوں میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاح بھی استعمال کی ہیں جس سے اس دور کے تعلیم وتربیت کے معیار کا پتہ چلتا ہے۔ سوداؔ کے قصیدوں کا کمال مطلع تشبیب اور گریز میں نمایاں ہوتا ہے۔ سوداؔ کے قصیدوں میں قصیدہ کے اجزائے ترکیبی پوری آن بان سے جلوہ گر ہیں۔ مطلع، تشبیب گریز، مدح یا ہجو اور دعا یہ تمام اجزائے ترکیبی ان کے قصیدوں کی شان دوبالا کرتے ہیں۔ سودا کے قصیدوں کی جان مطلع ہی میں ہے وہ اتنی برجستگی سے مطلع کے اشعار کہتے ہیں کہ سننے والے کے ذہن پر فوراً اثر کرتے ہیں۔

صباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام — حلال دخترِ رز بے نکاح و روزہ حرام
برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار — کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکر بہار

تشبیب میں بھی سوداؔ کے یہاں ایک نیا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ وہ اپنی تشبیبوں میں حکمت وفلسفہ کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ ان کی تشبیب میں ندرتِ الفاظ، مناظرِ قدرت، مضمون آفرینی، فلسفۂ اخلاق، شکوہ دوراں، حسن وعشق، کیفیت بہار وغیرہ کے مضامین ملتے ہیں وہ تشبیب و مدح کو ایک دوسرے میں پیوست کردیتے ہیں۔ ایک جگہ وہ مکالمہ نگاری کا انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک — دی وہیں آکے خوشی نے درِ دل پر دستک
پوچھا میں کون ہے بولی کہ میں وہ ہوں غافل — نہ لگے شوق میں جس کے کبھی شائق کی پلک

Scanned by CamScanner

سودا کی گریزیں امیر خسرو کے ٹکر کی ہیں۔ انھوں نے گریز لکھ کر اُردو شاعری میں نہایت اونچا مقام حاصل۔ کیا وہ اس گر سے خوب واقف ہیں اور تشبیب و مدح کو ایک دوسرے میں باہم پیوست کرنا جانتے ہیں۔

ہے مجھے فیض سخن اس کے ہی مداحی کا   ذات پر جس کے مبرہن کنہ عزو جل

کر کے دریافت یہ مجھ سے کیا اس نے کہ مگر   سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک

آج اس شخص کی ہے سالگرہ شادی کی   کہ بصورت ہے وہ انسان بہ سیرت ہے ملک

سودا نے بزرگوں کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں اُن میں وہ تمام اوصاف بیان کیے ہیں جو بزرگوں کی شان کے شایاں ہیں حضرت علی کی مدح میں لکھتے ہیں۔

علم تیرا نہیں کچھ علم خدا سے باہر   ہے عمل بھی وہی تیرا جو خدا کا ہے عمل

سودا اپنے قصیدوں میں مبالغہ آرائی اور تصنع سے بھی خوب کام لیتے ہیں وہ ممدوح کی شجاعت، دلیری، عدل وانصاف اور سخاوت کا ذکر کرتے ہیں اس طرح وہ ہجو میں بھی ماہر ہیں اپنے قصیدے تضحیک روزگار، ہجو اسپ میں لکھتے ہیں۔

قصاب پوچھتا ہے ہمیں کب کروگے یاد   اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

مدح کے قصائد میں وہ گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے میں جواب نہیں رکھتے ہیں وہ اس میں نئی تشبیہیں واستعارے استعمال کرتے ہیں۔

یرغہ وگام سے باہر ہے کچھ اس کی رفتار   ہے چھلاوے کی طرح چال میں اس کی چھل بل

قصیدے کے آخری جز مدعا و دعا میں بھی انھوں نے مہارت کا ثبوت دیا۔ سرفراز الدولہ کے قصیدے میں سودا اس طرح سے مدعا بیان کرتے ہیں

مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جا کہ   کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

اس طرح انھوں نے شہر آشوب وغیرہ میں زمانے کی بدحالی و پریشانی کا نقشہ اتارا ہے ان کو زبان پر حد درجہ کمال حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نئے الفاظ تراکیب ندرت بیان اور جدت ادا سے اردو قصیدہ نگاری کو مالا مال کردیا اس لئے انھیں قصیدہ کا نقاشِ اول کہا گیا۔

Scanned by CamScanner

پانچواں باب

خواجہ میر درد

اس دور کے تیسرے بڑے شاعر خواجہ میر، درد (۱۱۳۳ھ — ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/۲۱-۱۷۲۰ع — ۷ جنوری ۱۷۸۵ع) ہیں۔ اپنے نام ''خواجہ میر'' کے بارے میں درد نے لکھا ہے کہ یہ نام ان کے نانا میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں نے رکھا تھا[1] اور اپنے تخلص کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے والد کا تخلص عندلیب تھا جو انہوں نے اپنے پیر صحبت شاہ سعد اللہ گلشن کے تخلص کی مناسبت سے رکھا تھا۔ جیسے شاہ گلشن نے اپنا تخلص اپنے مرشد شاہ گل (عبدالاحد گل، وحدت) کی مناسبت سے رکھا، خواجہ میر نے عندلیب کی رعایت سے اپنا تخلص درد رکھا۔ ایک مقطع میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

درد از بس عندلیبِ گلشنِ وحدت شدہ است
جلوۂ روئے گلے او را غزل خواں می کند[2]

اپنے مرشد کے تخلص کی رعایت سے تخلص رکھنے کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد میر نے درد کی مناسبت سے اپنا تخلص اثر اور درد و اثر کی مناسبت سے درد کے بیٹے نے اپنا تخلص الم رکھا۔

خواجہ میر درد نجیب الطرفین حسینی سید تھے جن کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے حضرت بہاء الدین نقشبند سے اور ماں کی طرف سے سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔[3] خواجہ بہاء الدین نقشبند (م ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ع)[4] کا خاندان بخارا میں رہتا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد خواجہ محمد طاہر نقشبند اپنے بیٹوں کے ساتھ بخارا سے برعظیم آئے اور اورنگ زیب عالمگیر سے ملے۔ اورنگ زیب کے جدِ اعلیٰ امیر تیمور چونکہ حضرت نقشبند کے مرشد امیر کلال سے خاص ارادت رکھتے تھے، اسی لیے اورنگ زیب خواجہ محمد طاہر سے بہت تپاک سے پیش آئے اور انہیں منصب بھی پیش کیا جو انہوں نے قبول نہیں کیا اور کچھ عرصے بعد اپنے بیٹوں خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ فتح اللہ کو یہیں چھوڑ کر حج کی غرض سے واپس چلے گئے۔[5] عالمگیر نے خواجہ محمد صالح کو منصب عطا کیا اور مراد بخش کی بیٹی آسائش بانو سے شادی کر دی۔[6] خواجہ محمد یعقوب کو بھی منصب عطا کیا اور مراد بخش کی دوسری بیٹی سے شادی کر دی۔[7] خواجہ فتح اللہ نے اس خیال سے کہ ان کی نجابت متاثر ہوگی، شاہی خاندان میں شادی سے انکار کر دیا اور عالمگیر کے میر بخشی نواب سربلند خاں کی بہن سے شادی کر لی۔ اثر نے اپنی مثنوی ''بیان واقعہ'' میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

او بذاتِ خود نہ کرد ایں را قبول — تا نہ گردد مختلط آلِ رسول

یہی خواجہ فتح اللہ میر درد کے پردادا ہیں۔ سید نذیر فراق نے خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں (والد خواجہ محمد ناصر عندلیب) کو غلطی سے محمد شاہی دور کے مشہور امیر نواب روشن الدولہ ظفر خاں رستم جنگ سے ملا دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

نواب ظفر اللہ خاں اور ظفر خاں رستم جنگ دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں جیسا کہ ''مآثر المراء''[8] اور ''سیر المتاخرین'' سے واضح ہے اور خواجہ محمد ناصر عندلیب کے رسالے 'ہوش افزا' سے بھی جس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نواب روشن الدولہ وہ ہیں جنھوں نے اُس جوہری کو، جس نے ایک جفت فروش کو قتل کر دیا تھا، اپنے ہاں پناہ دی تھی اور سارے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ وہی واقعہ ہے جسے محمد شاہی دور میں بے نوا نامی شاعر نے اپنے اُردو مخمس کا موضوع بنایا تھا۔[9]

خواجہ محمد ناصر عندلیب (۱۱۰۵ھ[10]۔۱۱۷۲ھ[11]/۱۶۹۳ء۔۵۹۔۱۷۵۸ء) نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے میر محمد محفوظ پیدا ہوئے جو ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں اُنتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔[12] دوسری شادی میر سید محمد حسینی قادری (م ۱۱۵۶ھ[13]/۱۷۴۳ء) کی صاحب زادی سے ہوئی جن کے بطن سے خواجہ میر درد، خواجہ محمد میر اثر اور سید میر محمدی پیدا ہوئے۔ آخر الذکر ۵ ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ/۴ مارچ ۱۷۵۰ء کو ۱۱ سال کی عمر میں وفات پائی تھی اور میر درد نے لکھا ہے کہ یہی عمر ان کی وفات کی بھی ہے۔ رسالہ ''دردِ دل'' کے خاتمے میں لکھا ہے کہ:

''یہ اتفاق ہے کہ صحیفۂ واردات کا ورود حضور پر نور حضرت خواجہ محمد ناصر محمدی عندلیب کے سالِ وصال یعنی ۱۱۷۲ھ (۵۹۔۱۷۵۸ء) میں ہوا تھا۔ اسی طرح حسنِ اتفاق سے اس ختم التصنیفات کے مسودے کا اختتام بھی اسی سال واقع ہوا جو اس گنہگار فقیر خواجہ میر محمدی درد کا سالِ رحلت ہے۔ اختتامِ شمعِ محفل، کے حسنِ خاتمہ، کی خاموشی، ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) کے اسی ماہ صفر میں، ظاہرا ''دردِ دل'' کے خاتمہ بالخیر کے سکوت کے ساتھ جوڑ کر مقدر کر دی گئی ہے۔''[14]

ہدایت اللہ دہلوی کے قطعہ تاریخِ وفات کے آخری مصرعے ''حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب'' سے بھی ۱۱۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ میر محمدی اثر نے بھی ''وصلِ خواجہ میر درد'' سے سالِ وفات ۱۱۹۹ھ ہی نکالا ہے اور یہی سالِ وفات میر محمدی بیدار کے قطعۂ تاریخ کے اس شعر کے آخری مصرع سے بھی برآمد ہوتا ہے:

یک پہر شب ماندہ ہاتف کرد واویلا و گفت
ہائے بود آدینہ و بست و چہارم از صفر

میر محمدی بیدار نے اپنے قطعے کے اس مصرع میں ع ''حیف کز دنیا بعمر شصت و ہشتم سالگی'' وفات کے وقت درد کی عمر ۶۸ سال بتائی ہے لیکن درد کے اپنے بیان کی روشنی میں کہ ۱۱۹۹ھ میں ان کی عمر ۶۶ سال ہو گئی ہے اور یہی ان کے خاتمہ بالخیر کا سال ہے، میر محمدی بیدار کا درد کی عمر ۶۸ سال بتانا محض غلطی ہے۔ ۱۱۹۹ھ میں میر درد کی عمر ۶۶ سال تھی اور اس حساب سے ان کا سالِ پیدائش ۱۱۳۳ھ/۲۱۔۱۷۲۰ء ہوتا ہے جس کی مزید تصدیق سنا تھ سنگھ بیدار کے قطعۂ تاریخِ ولادت[15] سے بھی ہوتی ہے:

از حضرت درد عارف یزدانی — گہوارۂ آفاق چو شد نورانی
بیدار نوید سال تاریخش گفت — ''آمد بوجود نقش بند ثانی''

(۱۱۳۳ھ)

میر درد کی پیدائش کے وقت دلّی بظاہر آباد لیکن اجڑنے کے لیے تیار تھی۔

فتنہ و فساد ہر طرف سر اٹھا رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج وقتِ غروب کو پہنچ چکا تھا۔ محمد شاہ کی بادشاہی کا دوسرا سال تھا۔

Scanned with CamScanner

خواجہ میر درد فارسی و عربی کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور علمِ تصوف پر بھی قدرت رکھتے تھے جس کی تصدیق ان کی مختلف تصانیف سے ہوتی ہے۔ ''درد دل'' میں درد نے خود لکھا ہے کہ ''جناب اقدس کے ایما کے مطابق وسط جوانی میں عقائد، معقولات اور اصولِ تصوف وغیرہ کے علوم رسمیہ بقدر ضرور حاصل کیے تھے۔''[16] قدرت اللہ قاسم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''چند مہینے مفتی دولت مرحوم و مغفور کی خدمت میں، فنونِ رسمیہ کی تحصیل میں صرف کیے۔''[17] نوجوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔ قائم نے لکھا ہے کہ ''اس سے قبل سپاہی پیشگی میں اعزاز و امتیاز کے ساتھ بسر کرتے تھے۔''[18] لیکن ''تھوڑے دن ہوئے والد بزرگوار کے ایما کے مطابق اس کام سے دست بردار ہو کر کمال فقر و قناعت کے ساتھ سجادۂ طاعت پر متمکن ہیں۔''[19] خواجہ میر درد نے ''نالۂ درد'' میں لکھا ہے کہ ''ابھی عالم جوانی باقی تھا کہ اس عالم فانی و بے ثبات سے ہاتھ کھینچ لیا اور ۲۹ سال کی عمر میں لباسِ درویشانہ پہن لیا۔''[20] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں درد نے سپاہی پیشگی ترک کر کے لباسِ درویشی پہن لیا۔ موسیقی سے درد کا لگاؤ، اپنے والد کے پیر صحبت شاہ گلشن کی طرح، پیدائشی تھا۔ نقشبندیہ سلسلے میں سماع منع ہے لیکن باوجود یکہ درد کا تعلق اسی سلسلے سے تھا وہ ذوقِ موسیقی کو ترک نہ کر سکے اور جب ذوقِ موسیقی کے سلسلے میں ان پر اعتراضات ہوئے تو لکھا کہ:

''میرا سماع سننا من جانب اللہ ہے اور حق اس بات کا ہر وقت گواہ ہے کہ گانے والے خود بخود آتے ہیں..... یہ بات نہیں کہ میں ان کو طلب کرتا ہوں۔ سماع کو جسے دوسرے لوگ عبادت خیال کرتے ہیں، میں ایک ایسا معاملہ سمجھتا ہوں جس کا انکار بھی نہیں کرتا اور اس کی عادت بھی نہیں رکھتا اور میرا عقیدہ وہی ہے جو میرے بزرگوں کا ہے لیکن اس ابتلا میں چونکہ حسبِ مرضیِ الٰہی گرفتار ہوں ناچار خدا بھی مجھے بخش دے گا۔''[21]

اعتراضات سے مجبور ہو کر درد نے ذوقِ موسیقی کو ''ابتلا'' کہا ہے، یعنی ایسا ذوق جو بیماری کی طرح ان کی مجبوری ہے۔ موسیقی پر انہیں اتنا عبور حاصل تھا کہ اس دور کے باکمال موسیقار، ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے اور خواجہ میر درد کے اظہارِ پسندیدگی کو سند جانتے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ ''علمِ موسیقی میں ایسی مہارت تھی کہ میاں فیروز خاں، جو گانے والوں کے سردار تھے، ان کی خدمت میں اپنے نقش کرتے تھے۔''[22] ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو اپنے والد کے مزار پر مجلسِ غنا ترتیب دیتے جہاں شہر کے تمام چھوٹے بڑے حاضر ہوتے اور چابک دست مغنی اور بین نواز نغمہ پردازی و قانون نوازی میں مشغول ہوتے۔[23]

ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو میر درد کے ہاں مجلس ریختہ منعقد ہوتی۔ یہ اسی مجلسِ مراختہ کا تسلسل تھا جو ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو خانِ آرزو کے گھر پر ہوتی تھی۔ حاکم لاہوری کی ملاقات بھی میر درد سے یہیں ہوئی تھی۔[24] جب دلی اجڑی اور اہلِ کمال تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرنے لگے اور خانِ آرزو اس سلسلے کو اپنے ہاں جاری نہ رکھ سکے تو یہ مجلسِ ریختہ میر درد کے مکان پر ہونے لگی۔ اس کے بعد میر درد کے کہنے سے محمد تقی میر کے گھر پر ہونے لگی۔[25] نکات الشعرا کی تکمیل کے وقت یہ مجلسِ ریختہ میر کے ہاں ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں ۲۹ سال کی عمر میں جب میر درد نے ترکِ دنیا کر کے لباسِ درویشی پہنا اور ان کے معمولات بدلے تو یہ سلسلہ کچھ عرصے بعد محمد تقی میر کے ہاں منتقل ہو گیا۔

ادب و شاعری کی طرف ان کا رجحان ابتدائے عمر سے تھا۔ جب میر درد پندرہ سال کے تھے تو انہوں نے

Scanned with CamScanner

اپنی پہلی تصنیف ''اسرار الصلوٰۃ'' فارسی زبان میں لکھی اور ۱۱۵۳ھ/۴۱-۱۷۴۰ع میں جب ان کی عمر بیس سال تھی، انہوں نے اپنے والد کی تصنیف ''نالۂ عندلیب'' کا یہ قطعۂ تاریخ تصنیف لکھا جسے ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب نے خطبۂ کتاب میں داخل کرلیا:

سالِ تاریخِ ایں کلامِ شریف — کہ بسوئے حق انجذاب نماست
کرد الہام حق بگوش دلم — ''نالۂ عندلیب گلشن ماست''

درد کو پندرہ سال کی عمر میں فارسی پر اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ اس زبان میں رسالہ تصنیف کرسکیں۔ رسالہ ''اسرار الصلوٰۃ'' کے آخر میں ان کی ایک فارسی رباعی بھی درج ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ درد کی شاعری کا آغاز پندرہ سال کی عمر سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اُردو شاعری کا آغاز بھی کم و بیش اسی زمانے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ۱۱۷۲ھ (۵۹-۱۷۵۸ع) میں اپنے والد کی وفات کے بعد درد سجادہ نشیں ہوئے تو ان کی مصروفیات اور بڑھ گئیں لیکن شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ ''واردات'' ۱۱۷۲ھ (۵۹-۱۷۵۸ع) میں مکمل ہوئی اور ''اسرار الصلوٰۃ'' کو چھوڑ کر باقی ساری تصانیف ۱۱۷۲ھ سے ۱۱۹۹ھ (۱۷۵۸ سے ۱۷۸۸ع) تک وجود میں آئیں۔

میر درد ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ اور عالی رتبہ باپ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پائی جہاں علم و فضل بھی تھا اور حقیقت و سلوک کے مشاہدات بھی۔ دادا اور نانا دونوں کی طرف سے علم و عمل کی روایت ورثے میں پائی تھی۔ اچھے لوگوں کی صحبت اٹھائی تھی۔ خلیق و متواضع انسان تھے۔ ۲۶ شاہ گلشن سے خاص ارادت رکھتے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ان کے والد کے پیر صحبت تھے اور دوسرے اس لیے کہ وہ شاعر تھے اور موسیقی میں بھی خسروِ زماں سمجھے جاتے تھے۔ ۲۷ میر درد نے خود بھی یہی لکھا ہے کہ ''شاہ گلشن علم موسیقی میں پورا دخل رکھتے تھے۔'' ۲۸ شاہ گلشن کی طرح خواجہ میر درد بھی تصوف، موسیقی اور شاعری کی طرف فطری رجحان رکھتے تھے اور نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھنے کے باوجود ذوقِ سماع کو منجانب اللہ جانتے تھے۔ میر درد میں ذہانت و ذکاوت بھی خداداد تھی۔ خانِ آرزو نے ''بہت صاحبِ فہم و ذکا جوان ہے'' ۲۹ کے الفاظ لکھے ہیں۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے ان کے علم و فضل اور گہرے شعور و ادراک کا پتا چلتا ہے۔ وہ فارسی و اُردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کی ساری نثری تصانیف فارسی زبان میں ہیں اور عبادت میں کثرت سے قرآن و حدیث کے حوالے دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں عربی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ایک طرف علومِ رسمیہ پر دسترس رکھتے تھے اور دوسری طرف تعلیم رحمانی سے بھی بہرہ مند تھے۔ قدرت اللہ شوق نے انہیں ''مردِ وجیہ'' لکھا ہے اور ان کے اوصاف و اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ترک، تجرید و استغنا میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ۳۰ درد ایک ایسے انسان تھے جنہیں قدرت نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسن صورت سے بھی نوازا تھا۔ ان کے مزاج میں اعتدال، توازن، حلم، تحمل و بردباری کی صفات موجود تھیں، اسی لیے جہاں جاتے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے اور مسندِ بلند پر بٹھائے جاتے۔ نہ خود ادب آداب کی خلاف ورزی کرتے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتے۔ ایک دن بادشاہِ وقت شاہ عالم ثانی درد کی زیارت کے لیے ان کی مجلس میں تشریف لائے۔ کچھ دیر بعد درد کا عذر کرکے پاؤں پھیلا دیا۔ بادشاہ کی یہ حرکت آدابِ مجلس کے خلاف تھی۔ درد کو ناگوار گزری اور انہوں نے بھی بادشاہ کی طرف پیر پھیلا دیا۔ ۳۱ ان کی مجلسِ فقر ایک ایسا دربار تھی جہاں

Scanned with CamScanner

بادشاہ بھی تخت سے اتر کر آتا تھا، اسی لیے اِستغنا و خودداری ان کے مزاج کا حصہ تھی:

نہیں مذکورِ شاہاں درد ہرگز اپنی مجلس میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادھم کا

ان کے مزاج میں تہذیبی رچاوٹ، روایت پسندی اور نکھرا استھرا پن تھا اور انہی صفات کا عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ خواجہ میر درد نے ہجو یا قصیدے سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا حالانکہ معاصر شعرا میں سودا نے ''در مدح سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر'' جو قصیدہ لکھا، اس میں جن معاصر شعرا پر چوٹیں کی ہیں ان میں درد بھی شامل ہیں۔۳۲ درد نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی غزل کے ایک مقطع میں صرف اتنا کہا:

سودا اگرچہ درد تو خاموش ہے ولے
جوں غنچہ سو زبان ہیں اس کے دہن کے بیچ

چونکہ ''نکات الشعرا'' کے انتخابِ کلامِ سودا میں یہ شعر موجود ہے، قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء سے پہلے کہے گئے تھے۔

میر درد کے مزاج میں استقلال، ہمواری اور ٹھہراؤ تھا۔ ان کے تعلقات اسی سطح پر سب سے قائم تھے۔ انسانی رشتوں کا احترام ان کے لیے مذہب کا درجہ رکھتا تھا اور دل آزادی کو وہ گناہ سمجھتے تھے۔ خواجہ میر درد ہمیشہ انسان میں خدا کو دیکھتے رہے:

یا رب درست گو نہ رہوں عہد پر ترے
بندے سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل
کر زندگی اس طور سے اے درد جہاں میں
خاطر پہ کسو شخص کے تو بار نہ ہووے

وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ امراللہ الہ آبادی ۳۳ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ میر درد ایک دن باغ کی سیر کو گئے۔ ان کی نظر پھولوں پر پڑی تو دیکھا کہ کچھ پھول مرجھا گئے ہیں اور کچھ تازہ و شگفتہ ہیں۔ کلیوں اور پھولوں کی شادابی و افسردگی کو دیکھ کر انہیں اپنا آغاز و انجام آ گیا۔ دلِ پُر درد سے بے اختیار آہ نکلی اور یہ دوہرا بند زبان پر جاری ہو گیا:

کیسی تو کوں بھاوت ہے اور کیسی کی سکھ پاوت ہے
یہ پھلواری درد ہمیں کچھ اور سمیں دکھلاوت ہے
کلیاں من میں سوچت ہیں جب پھول کوئی کھلاوت ہے
جا دن وا پر بیت گیو سو وا دن مو پر آوت ہے

استقلال ان کے مزاج میں ایسا تھا کہ دلّی کے اجڑنے پر جب عزت دار بے عزت ہو گئے اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے دلی چھوڑ کر باہر جانے لگے، وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ساری تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ اس دور میں جب ہر چیز تلپٹ ہو رہی تھی، میر درد سدِ سکندری کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ ان کی زندگی ایک صوفی و درویش کی زندگی تھی۔ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا۔ جو وقت بچتا وہ تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا جس کا اندازہ ان کی تصانیف کی تعداد اور حجم کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ میر درد صوفی اور شاعر دونوں حیثیت سے بلند مرتبے

Scanned with CamScanner

کے مالک تھے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں ان کا نام میر و سودا کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ درد کی شخصیت اپنے معاصرین کے مقابلے میں اس لیے بھی منفرد ہے کہ ان کے ہاں وہ توازن نظر آتا ہے جو دوسروں کے ہاں دکھائی نہیں دیتا اور یہ توازن اس غیر متوازن دور میں تصوف کے ذریعے ان کے کردار و مزاج میں پیدا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کے کسی رخ کو دیکھیے یہ خصوصیت ان کی فکر، احساس، عمل، طرز زندگی، شاعری، نثر سب جگہ نظر آئے گی۔ وہ ایک بڑے شاعر اور ایسے باکمال صوفی، عالم اور فقیہہ تھے کہ جس نے شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کے مدارج طے کیے تھے۔ انہوں نے ایک طرف تصوف کی بلند پایہ تصانیف قلم بند کیں، تصوف کے ایک نئے سلسلے ''طریقِ محمدی'' کو قائم کیا اور دوسری طرف شاعری میں معرفت کے ایسے پھول کھلائے جو آج بھی تر و تازہ ہیں۔ ہمواری ان کے کلام کا بنیادی وصف ہے۔ انہوں نے میر و سودا کی طرح مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی نہیں کی بلکہ غزل و رباعیات ہی وہ اصناف ہیں جن میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا۔ خوش ذوقی ان کی شخصیت و سیرت کا نمایاں پہلو ہے۔ انہی صفات کو دیکھ کر قدرت اللہ شوق نے انہیں ''شاعرِ نازک مزاج، خوش خیال، معنی یاب، فاضل مستعد، عالم مستند، صوفی مشرب''[۳۴] لکھا ہے۔

(۲)

6.2 محمد تقی میر کے حالاتِ زندگی

محمد تقی میر 20 ستمبر 1722ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ 1810ء میں وہ لکھنو میں وفات پا گئے۔ میر کے بزرگ حجاز سے دکن آئے تھے، مگر اُن کے پردادا اکبرآباد گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ میر کے والد ایک گوشہ نشیں درویش تھے۔ میر نے اپنی خودنوشت ''ذکرِ میر'' میں اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ ایک صالح عاشق پیشہ شخص تھے، گرم دل کے مالک، شب زندہ دار اور روز حیران کار''

میر اپنے والد کی صحبت سے متاثر ہوئے ''ذکرِ میر'' میں درج ہے کہ ان کے والد اُن سے کہا کرتے ''اے بیٹے عشق اختیار کر، کیونکہ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے، دنیا میں جو کچھ ہے، عشق کا مظہر ہے''۔ بدقسمتی سے گیارہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کے سوتیلے

بھائی حافظ محمد حسن نے ان سے برا سلوک کیا۔ جب تک وہ آگرے میں رہے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری میر امان اللہ نے قبول کی۔ میر امان اللہ خود درویشانہ طبیعت رکھتے تھے۔ وہ میر کے والد کے بہت قریب تھے۔ میر ان کو عمِ بزرگوار سے موسوم کرتے تھے۔ ظاہر ہے میر کی ابتدائی زندگی یتیمی، بے کسی اور ناداری میں گزری۔ ان کے سوتیلے ماموں خان آرزو نے بھی ان کو ذہنی تکلیف پہنچائی، ان حالات میں میر جو ایک غم پسند دل لے کے آئے تھے، زیادہ ہی درد و غم میں ڈوب گئے۔ یہ احساسِ غم ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ بے سروسامانی کی حالت میں انھیں تلاشِ معاش کے لیے گھر سے نکلنا پڑا، لیکن یہاں بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اسی حالت میں انھیں جنون کے دورے پڑنے لگے اور وہ بے دماغی اور بد دماغی کے شکار ہوئے۔ جیسا کہ انھوں نے خود بھی لکھا ہے

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جیئیں وہ، روگ جن کے جی کو یہ اکثر رہیں

.....

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر ایک گہری افسردگی کے شکار رہے لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے ان کی شخصیت میں انسانی دردمندی کا رخ اختیار کیا۔ دردمندی نے ان کی شخصیت میں توازن برقرار رکھنے میں مدد دی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔:

''ان کے غم انگیز اشعار کو پڑھ کر طبیعت کند نہیں ہوتی۔ ان کا غم پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے غم میں شریک ہونے کو جی چاہتا ہے''

چونکہ میر کی طبیعت پر ان کے والد کے گہرے اثرات تھے اور انھیں عشق کرنے کی تلقین کرتے تھے اس لیے وہ اوائل عمر سے ہی جذبۂ عشق سے آشنا ہوئے، چنانچہ منشی احمد حسین سحر نے لکھا ہے:

''مشہور است کہ بشیر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع میل خاطر داشتہ''

(یہ بات مشہور ہے کہ ان کو اپنے شہر میں ایک پری پیکر سے جو ان کی رشتہ دار تھی، در پردہ عشق اور دلی رغبت تھی)

میر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ آگرے میں مصیبتوں کا سامنا کرنے کے باوجود جب روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی تو خواجہ محمد باسط کے توسط سے ان کے چچا صمصام الدولہ امیر الامراء نے دہلی میں ان کے لیے ایک روپے کا روزینہ مقرر کیا لیکن اسی زمانے میں نادر شاہ نے دلی پر چڑھائی کی اور اس شہر کو تباہ کیا۔ جنگ میں صمصام الدولہ قتل ہوئے اور میر روزینے سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد وہ واپس آگرہ گئے، وہاں مایوسی کا سامنا کرنے پر پھر دلی کا رخ کیا۔ دلی میں ان کی زندگی پیہم شکستوں اور محرمیوں سے عبارت رہی، مختلف امیروں اور نوابوں کے یہاں ملازمت اختیار کی لیکن یہ مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ بن سکی، آخر کار وہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے، لکھنؤ کی روانگی کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''اِن ایام میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن زادِ راہ سے مجبور تھا، میری عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کے دل میں خیال آیا کہ میر پاس آئے تو اچھا ہے۔''

لکھنؤ میں آصف الدولہ سے قربت رہی لیکن اب وہ غمِ حیات سے بجھ چکے تھے۔ آخر بہ روز جمعہ 20 ستمبر 1810ء کو لگ بھگ 90 سال کی عمر میں انتقال کر گئے

میر کی تصانیف درج ذیل ہیں:

1. غزلوں کے چھے دیوان
2. ایک فارسی دیوان
3. کئی مثنویاں
4. ایک رسالہ بہ زبان فارسی
5. شعرائے اردو کا تذکرہ بہ عنوان نکات الشعراء
6. خودنوشت سوانح عمری بہ عنوان ذکر میر

ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

''میر نے نوے سال کی طویل زندگی میں عالم، نقاد، عشق پیشہ، بادشاہوں کے ہم نشیں، درویش، ایک بڑے شاعر، غرض ایک بھرپور شخصیت تھے۔ انھوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا'' (میر ہمارے عہد میں)

Scanned with CamSc

6.3 میر کی غزل گوئی

میر کی شاعری کو سمجھنے اور اس کا محاکمہ کرنے کے لیے ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی اور پھر ان کے عہد کے تاریخی حالات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ان کی گھریلو زندگی افلاس اور بے سروسامانی میں گزری۔ ان کے منھ بولے چچا امان اللہ انھیں فقیری، داخلیت پسندی، تحمّل خاطر اور خلوت پسندی کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ تصوف کی طرف مائل ہوئے، خارجی حالات انتشار اور افراتفری کی زد میں تھے۔ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) کے بعد ملک سیاسی طور پر غیر یقینیت کا شکار ہوا، سماجی، تہذیبی اور علمی مشاغل انحطاط کی طرف مائل تھے، بیرونی حملوں نے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اندرونی بغاوتوں نے لوٹ مار اور خوں ریزی کا بازار گرم کیا تھا۔ میر ان ہوش ربا اور انتشار خیز حالات و واقعات سے گزرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی شعری شخصیت ان سے گہرے طور پر متاثر ہوئی اور اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے لیے یہ حالات ایک بنیادی شعری محرک بن گئے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

''میر نے حیرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور برتا'' (مقدمہ انتخاب کلامِ میر)

مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:

''میر کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کے زمانے کے معاشرتی ماحول اور ان اسباب و حالات پر جن کے اندر رہ کر میر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی، دقیق نگاہ ڈالی جائے۔'' (میر اور ہم)

خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ:

''میر کی زندگی اور شاعری کو اس سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔'' (میر: حیات اور شاعری)

عام طور پر میر کی شاعری پر لکھتے ہوئے نقادوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میر کی شاعری ان کے ذاتی دکھ درد اور ان کے عہد کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر کی شاعری کے بارے میں یہ مروجہ خیالات میر کی شاعرانہ عظمت پر دلالت نہیں کرتے۔ میر ایک منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا اعتراف نہ صرف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ معاصر نقادوں میں مولوی عبدالحق، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، حسن عسکری، نظیر صدیقی، شبیہہ الحسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور حامدی کاشمیری نے بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں، جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی دریا بے خروش نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی اور ایک طغیانی مچائے رکھتی ہیں اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے'' (انتخابِ کلامِ میر)

مولوی عبدالحق نے میر صاحب کے کلام میں ''حیرت انگیز جلوے'' کا ذکر کرکے تاثراتی انداز میں سہی، میر شناسی میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔ جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو میر کی شاعری کے حیرت انگیز جلووں'' کا ذکر ان کے اشعار میں کثیر المعنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے خود میر اپنی شاعری کی اس خصوصیت سے آگاہ تھے، کہتے ہیں:

صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

یہ دراصل ان کی شاعری کی ''صد رنگی'' ہے جو ان کی عظمت کے لیے راستہ کھولتی ہے اس سے فوری طور پر اس مفروضے کا ابطال ہوتا ہے کہ میر اپنے

Scanned with CamSc

عہد اور اپنی ذات کے ترجمان تھے۔ یہ خیال شاعری کو منظوم صحافت کی سطح پر لاتا ہے۔ میر ایک بلند پایہ تخلیق کار ہیں خارجی حالات و واقعات سے وہ متاثر ضرور ہوئے لیکن وہ ان کی تخلیقی قوتوں کو جگانے کا موجب بن گئے۔ غالب بھی ایک پرآشوب دور میں لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنے عہد میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ملک کی تباہی بربادی کے مناظر دیکھے لیکن ان کے اشعار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کوئی شہرآشوب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کہا کہ وہ لاشعور سے رابطہ رکھتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

''غیب'' سے ان کی مراد لاشعور ہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک بڑا تخلیق کار اپنی زندگی یا عہد کے حالات کا اثر قبول تو کرتا ہے مگر یہ اس کی تخلیقی قوت ہے جو متحرک ہوتی ہے اور پھر وہ اس کے موثر اظہار کے لیے لفظوں کی ترکیب سے کام لیتا ہے۔ میر کی شاعری میں یہی تخلیقی عمل کارفرما ہے۔ ان کے یہاں تخیل کی کارگزاری اور عمل داری اتنی نمایاں ہے کہ انھیں دنیا کے بڑے شعرا میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ قسم کی شاعری میں جو مظاہر، اشیا اور موجودات ابھرتے ہیں وہ حقیقی صورت کو تج کر ایک نئی شکل اختیار کرتے ہیں۔ میر کی غزلوں میں بھی اشیا کی صورت بدل جاتی ہے۔ ذیل میں تین اشعار درج کیے جاتے ہیں ان میں اشیا ایک نئی صورت میں نظر آتی ہیں:

1. خورشید و ماہ و گل کبھی اودھر رہے ہیں دیکھ
اس چہرے کا اک آئینہ حیران ہی نہیں

2. شامِ شبِ وصال ہوئی ہاں کہ اس طرف
ہونے لگا طلوع ہی خورشیدِ روسیاہ

3. لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

پہلے شعر میں خورشید و ماہ و گل کے ساتھ ہی آئینہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسرے شعر میں خورشید کو روسیاہ دکھایا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں آفاق' کارگہہ شیشہ گری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین :

''میر کی شاعری کا اصلی محور عشق ہے''

آیئے اب میر کی غزلوں میں ابھرنے والی شعری دنیا میں نمایاں واقعات کی نشان دہی کریں۔ اس دنیا میں ایک عشق پیشہ کردار ابھرتا ہے جو میر کی حقیقی زندگی میں عشق کی ناکامی کی یاد دلاتا ہے۔ حقیقی زندگی میں انھوں نے ایک پری تمثال لڑکی سے درپردہ عشق کیا تھا یا نہیں' جدید تحقیق نے اس کے بارے میں شکوک کو جنم دیا ہے۔ تاہم ان کی شاعری میں جذبۂ عشق کا خوب اظہار ملتا ہے۔ ان کے جذبۂ عشق کے کئی پہلو ہیں۔ وہ اس جذبے سے اپنے وجود کو گداز کر چکے تھے۔ عشق نے ان کے تن بدن میں وہ آگ لگائی ہے کہ ان کے استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں۔

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

ان کے عشقیہ اشعار میں حسنِ نسوانی کی دلکشیوں' محبوب کے بدن کی خواہش' کیفِ وصال اور کربِ انتظار کی کیفیات ملتی ہیں۔ انھوں نے دل کے جانے کا ذکر کیا ہے اور اسے ''عجب سانحہ'' قرار دیا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

ان کے یہاں عشق زندگی کا ایک اہم اور سنجیدہ تجربہ ہے۔ وہ اسے جنسی ابتذال کی پست سطح سے اٹھاتے ہیں اور روحانی رفعت اور فکری تب و تاب میں بدل دیتے ہیں۔ جذبۂ عشق ان میں خارجی دنیا سے برگشتگی اور داخلیت پسندی کے رجحان کو تقویت دیتا ہے۔ عشق دنیا کی ساری زبانوں کی شاعری

میں ایک بنیادی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ابھرتی رہی ہیں۔ حافظ، غالب اور اقبال کے یہاں عشق علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ عشق ان کے یہاں داخلیت، خودآگہی، عرفان، تلاش اور جوشِ حیات کی علامت بن جاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں ایسے عشقیہ اشعار بھی ملتے ہیں جو روایت اور تقلید کا پتہ دیتے ہیں۔ ولی کے بعد مظہر جان جاناں اور سودا، درد اور میر سوز کے یہاں عشق کے روایتی موضوعات کی کمی نہیں۔ خود میر کے دواوین میں بھی روایت غالب رہی ہے۔ تاہم میر کے چیدہ چیدہ اشعار میں عشقیہ تجربات کی تازگی اور سچائی کا پتہ ملتا ہے۔

ان کے یہاں عورت کا جو کردار ابھرتا ہے، وہ غیر انسانی نہیں۔ وہ خوب صورت عورت کی زندہ، شوخ اور طرح دار شخصیت ہے۔ اس سے میر کے یہاں حسیات کی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ حسیات کی شفی جمالیاتی کیفیت کو جگاتی ہے۔

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پر سوتا تھا
آئی نسیم جو صبح سے ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

......

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

......

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

اس نوع کے عشقیہ اشعار میر کے جمالیاتی احساس کی نزاکت اور پاکیزگی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ زندگی کی بھیانک حقیقت کا اشاریہ بھی بن جاتے ہیں۔ محبوبہ عاشق کے دل پر مکمل تصرف پاتی ہے مگر خود نا قابلِ تسخیر رہتی ہے اور عاشق کو کرب، وحشت اور بے کسی سے آشنا کرتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے ان میں محبوبہ ایک ساحرہ ہے جو عاشق کو مبہوت کرتی ہے:

مبہوت ہوگیا ہے جہاں اک نظر کیے
جاتی نہیں ان آنکھوں کی جادوگری ہنوز

اس محبوب کی گلی میں عاشق کا جانا اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے:

کیا بندھا ہے اس کے کوچے کا طلسم
پھر نہ آیا جو کوئی ادھر گیا

میر کی شاعری میں متصوفانہ خیالات و تجربات کا بھی نمایاں طور پر اظہار ملتا ہے۔ تصوف نے انھیں خالق و مخلوق کے رشتوں کا احساس دلایا۔ انھیں بچپن ہی سے صوفیانہ ماحول ملا تھا۔ ان کے والد اور منھ بولے چچا دونوں ان کو دنیوی خواہشات سے کنارہ کش ہو کر اپنے من میں ڈوبنے کی تعلیم دیتے رہے، چنانچہ خودآگہی، قناعت اور استغراق ان کی طبیعت کا خاصہ بن گئے۔ وہ بعض فکری میلانات کا اظہار کرنے لگے اور زندگی، موت اور کائنات کے مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔

صوفی، سلوک کی مختلف منزلوں سے گزر کے فنافی اللہ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ ازلی حقیقت کا حصہ بن جاتا ہے۔ حامدی کاشمیری میر پر اپنی کتاب ''کارگہہ شیشہ گری، میر کا مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''میر بھی صوفی تھے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ صوفیانہ رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میر درد کی طرح عملی اور ہمہ وقتی صوفی نہ تھے''۔ ان کے نزدیک دل نسخۂ تصوف ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے:

Scanned with CamSc

دل وجب نسخہ ' تصوف ہے
ہم نہ سمجھے برا تاسف ہے

میر صوفی کے مانند اپنی شاعری میں تصوف کے مختلف پہلو ابھارتے ہیں:

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

.....

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

.....

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

.....

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

انسان کو جیتے جی زندگی اور موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میر کے خیال میں موت ایک ناگزیر، سفاک اور اٹل حقیقت ہے:

صد حرف زیر خاک تہہ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

.....

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نہ یہ سن کر تبسم کیا

.....

اے عدم میں جانے والو ' تم تو چلو
ہم بھی اب کوئی دم میں آے ہیں

اس میں شبہ نہیں کہ موت کی غارت گری ہر چیز کو بے معنی بناتی ہے اور وہ درد و غم کا پیکر بن جاتے ہیں۔ انھیں زندگی اور حسن کی بے ثباتی افسردہ ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کے غم میں گھرے رہنے سے بعض نقاد انھیں قنوطی شاعر قرار دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میر کے دل سے جب کوئی بات نکلی، وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی۔'' (انتخاب کلام میر)

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ

''وہ یاس پرست تھے ان کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی تھی''

میر کو قنوطی اور یاس پرست قرار دینا درست نہیں۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب میں میر کو قنوطی قرار دینے سے انکار کیا۔ زیادہ سے زیادہ ا پسندی کو زندگی کے المیے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں نشاط و سرخوشی کے احساسات بھی ہیں۔

میر تقی میر غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں، ان کی استادی کا اعتراف غالب نے یوں کیا ہے:

ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

Scanned with CamSc

انھوں نے میر کے دیوان کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ ان کا دیوان ''گلشن کشمیر'' سے کم نہیں ہے۔ اسی طرح تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی قادرالکلامی کا اعتراف کیا ہے:

قائم : فروغ محفل سخن پردازاں جامع آیات سخن دانی

گردیزی: سخن سنج بے نظیر

میر حسن : شاعر دل پذیر

مصحفی : درفن شعر ریختہ مرد صاحب کمال

شیفتہ : سخن ور عالی مقام

غالب ہی کی طرح دوسرے شعرا نے بھی میر کے باکمال شاعر ہونے کی توثیق کی ہے۔

سودا : سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ناسخ : شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی کا خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

حسرت : شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اس میں شک نہیں کہ میر کا ''شیوۂ گفتار'' منفرد ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ''ان کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست و فصاحت کے ساتھ پیرایۂ بیان کس قدر دل کش، نرالا اور پرتاثیر ہے''

اہم بات یہ ہے کہ ان کے اشعار ایک فطری بہاؤ رکھتے ہیں۔ یہ شعوری آرائش، صنعت کاری اور تصنع سے پاک ہیں۔ ان کے یہاں شعری اظہار کسی ارادی منصوبہ بندی کا مرہون منت نہیں۔ وہ بعض لکھنوی شعرا مثلاً ناسخ کی طرح شعر کو الفاظ سے بوجھل نہیں بناتے۔ وہ آمد کے شاعر ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے باطن سے اشعار یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے کسی پہاڑ کے دامن سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر کسی موضوع یا مضمون مثلاً تاریخی حالات، ذاتی واردات، عشق یا تصوف کو ہاتھ نہیں لگاتے، وہ ان کو شعری عمل سے دور رکھتے ہیں اور شعری عمل کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ میر تخلیق کے لاشعوری عمل کو روا رکھتے ہیں تخلیقی عمل میں وہ خارجی اور داخلی دنیا میں فرق نہیں کرتے، وہ شعور اور لاشعور کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں اور شخصیت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان سے ان کا کلام ''طبع رواں'' کی صورت اختیار کرتا ہے:

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
پہنچی ہے اس سرے تیئں طبع رواں کی بات

.....

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

میر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ روایتی نہیں بلکہ تازہ کار ہے۔ یہ فارسی سے استفادے کو ظاہر تو کرتی ہے مگر اس سے مغلوب نہیں۔ ان کی زبان ہندوستانی سرزمین کی بو باس رکھتی ہے۔ یہ نرمی، سادگی اور مٹھاس رکھتی ہے۔ ان کی شعری زبان آنے والے کئی شعرا کے لیے سرچشمۂ فیض کا درجہ رکھتی ہے۔ موجودہ دور میں عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھری، میراجی، فراق اور ناصر کاظمی خاص طور پر میر کی زبان سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی، ابن انشا اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو باقاعدہ میر کے شعری آہنگ اور اسلوب کے احیا کی طرف دھیان دیا۔ میر الفاظ کے پارکھ ہیں وہ فرسودہ فارسی الفاظ کے بجائے ایسے الفاظ برتتے ہیں جو اصلی اور فطری ہیں انھوں نے خود کہا ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

Scanned with CamSc